

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

ایک دفعہ پھر مسئلہ رجم پر بحث چھیڑ گئی ہے۔

مختلف مدارس فکر کے ۲۶ اہل علم کا ایک متفقہ بیان ہمارے سامنے ہے۔ اس مختصر بیان کا اہم حصہ درج ذیل ہے۔

”شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزائے رجم تمام مسلم ائمہ مجتہدین کے نزدیک حدود میں شامل ہے۔ احادیث متواترہ اور اجلاہ امت سے واضح طور پر اس کا ثبوت موجود ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بہ طور حد رجم کی سزا سنائی گئی ہے۔“
منصورہ لاہور سے میاں طفیل محمد صاحب نے اپنے بیان میں اسی بات کو ذرا زیادہ زور سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

”ہم نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ عدالت کا یہ فیصلہ (یعنی سزائے رجم اسلامی حد نہیں ہے) شریعت اسلامی کے صریحاً خلاف ہے۔ کیونکہ شادی شدہ زانی و زانیہ کے لیے رجم کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوی و فعلی سنت سے نہایت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اسلامی قوانین کا ماخذ جس طرح سے قرآن مجید ہے، اسی طرح سے سنت رسول بھی ہے۔ رجم تعزیری سزا بھی نہیں کہ جس کا نفاذ حکومت یا عدالت کی صوابیت پر چھوڑ دیا گیا ہو بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں رجم کے لیے حد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے جو شخص بھی رجم کو اسلامی احکام کے منافی کہتا ہے یا اس میں ترمیم تفسیح کرنے یا ایسا مشورہ دینے کی جسارت کرتا ہے وہ سنت رسول کو مسترد کرنے کا

مرکب ہوتا ہے۔ یہ بڑی اہم انگیز بات ہے کہ جن لوگوں کو پاکستان میں اسلامی قوانین کی تنفیذ و تعمیل کی ذمہ داری سونپی گئی ہے وہی ایسے غلط فیصلے کرنے لگیں۔

راقم نے جہاں تک اس مسئلے پر غور کیا ہے، اُمت اسلامیہ کی پوری تاریخ میں، دورِ رحمت و سعادت اور خلافتِ راشدہ سے لے کر، بعد کے تمام باہرینِ قانون و فقہ اور فاضلوں اور مفتیوں تک اگرچہ تسلسل سے رجیم کی حد پر قرار دیا ہے، اور یہ بات خود اس حد کے واجب القبول اور لازم النفاذ ہونے کی دلیل ہے، مگر اُمت میں فحاش و معززہ کے دور سے لے کر آج تک جہاں کہیں فتنہ الکفارِ حدیث پایا گیا ہے، وہاں حدِ رجیم کے خلاف دلیل بازی ہوتی رہی ہے۔ یہ دلیل بازی کچھلی چودہ صدیوں میں کتاب و سنت کو سرچشمہ قانون بنانے والے کثیر العددِ عظیم علماء اور اُن پر اعتماد کرنے والے عوام کی قربت کی وجہ سے نتیجہ خیز نہیں ہو سکی۔

ہمارے جہاں جب موجودہ معاشرے اور اس کی جدید تعلیم یافتہ قیادت اور خاص طور پر اس کی بیوروکریسی میں مغرب پرستی کا مرضی بڑھا اور مغرب ہی ایک طبقے کے لیے اسی حد تک معیارِ فیصلہ بن گیا کہ اسی معیار کے مطابق فیصلہ کیا جانا چاہیے کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ شریعت کے احکام کیا ہونے چاہئیں اور اُن کی تعبیر و ترمیم کس طرح کی جانی چاہیے؟ ہمارے جدید طبقوں نے جب کسی عقیدے یا حکم کے متعلق اپنے اندر بغاوت کا رجحان دیکھا یا جدید تہذیب کو اسی پرچی پر جہیں پایا تو اُس کے قائم شدہ علمی اور عملی تصور سے بچ نکلنے اور اسی کے مفہوم کو مسخ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اگر احادیث نے تجدد کا راستہ رکھا تو اولاً انہوں نے یہ کہا کہ یہ احادیث صریحاً عقل کے خلاف ہیں یا قرآن سے ٹکراتی ہیں، لہذا صحیح نہیں ہیں۔ پھر جب دیکھا کہ یہ مشکل تو تقریباً ہر مسئلے میں پیش آتی ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شاعرانہ حیثیت کو ختم کیا، ان کے منصبِ تبیین و ترمیمِ قرآن کو چھینا اور اُن کو قرآنی حقائق کی عملی تفسیر پیش کرنے والے واجب الاتباع صاحبِ اسوہ ہونے کے رتبہ سے محروم کیا (نہوذاً باللہ) آخری تدبیر یہ نکالی کہ رسولِ خدا کی احادیث سے جو احکام ثابت ہیں وہ آپ نے بحیثیت امیرِ مومنین کے لیے دیے تھے، ہم سے کیا سروکار۔

پھر جب آیات سے اُن کی مسئلہ عملی تفصیل الگ کر دی گئی تو اس گروہ نے کہا کہ یہ خلا، جو پیدا ہو گیا ہے اسے علمی طور پر پرہم پورا کریں گے اور سیاسی اور انتظامی طور پر یہ کام خدا و رسولؐ کے کرنے کا ہے اور خدا و رسولؐ کے معنی ”مرکزِ ملت“ ہیں اور ”مرکزِ ملت“ کا مطلب سربراہ ریاست یا معاشرے کی قوتِ حاکمہ (SOVEREIGN POWER) ہے۔ پہلی بار ان معنوں میں ”مرکزِ ملت“ کا اطلاق سابق گورنر جنرل ملک غلام کی حکومت پر کیا گیا۔

آئیے ذرا اس طبقے کے طرزِ استدلال ملاحظہ فرمائیے:

”قرآنِ کریم میں نہ ناکِ سزا رجم (سنگسار) کہیں نہیں آئی۔ نہ شادی شدہ کے لیے نہ غیر شادی شدہ کے لیے۔ سنگسار کی سزا بعد میں وضع کردہ ہے۔ (واقعاتی تاریخ میں سے اس زمانے کا تعین ہونا چاہیے تھا اور وضع کرنے والے اشخاص کا بھی۔ دئے۔ ص) اور اُسے منسوب کیا جاتا ہے حضور رسالت مآب کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ (معاذ اللہ) قرآن کے احکام کے خلاف بھی فیصلے دیا کرتے تھے“

(قرآنی فیصلے، مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام کراچی۔ سال ۱۹۵۳ء۔ ص ۱۷۷)

جی ہاں! حضورؐ نے نماز اور زکوٰۃ کی جو تفصیلات دی ہیں، وہ سب بھی قرآن پر اضافہ ہیں۔ ایک ایسے حکم کو جس کے کسی بھی شکل میں ادا کر لینے کی آزادی حاصل تھی، اُسے متعین صورتوں کا پابند بنا کر (نعوذ باللہ) ان حضرات کے فلسفے کی رُو سے قرآن پر اضافہ کیا، بلکہ حقیقت میں مخالفت کی۔ اسی طرح سارق اور سارقہ خواہ ایک دمڑی کے مولے میں مجرم ہوں، خواہ بانک سے توڑے اٹھا لے جائیں، قرآن کی رُو سے اُن کے ہاتھ کاٹ دینے چاہئیں۔ کوئی پابندی نہیں کہ ہاتھ کی تعریف کیا ہے، یعنی کہاں تک ہاتھ شمار ہوگا۔ (آیت وضو سامنے رہے) اور کیسے کاٹا جائے، ایک ٹوکے سے یا آدے سے، یا کدال کستی سے؟ ان باتوں کی وضاحت فرما کر حضورؐ نے کیا کتاب اللہ میں اضافہ کیا ہے یا اس کی مخالفت کی ہے؟

اصل قصہ یہ ہے کہ یہ حضرات رسولؐ کو شارع (مأمور من اللہ) مانتے ہی نہیں کہ الفاظِ قرآن کے علاوہ رسولؐ خدا کے کسی فرمان یا حکم کو ثابت ہونے پر اس شعور سے قبول کر لیں کہ یہ اس خدا کی مفسرِ قرآن

صاحبِ اسوۂ حسنہ اور مطاعِ باذنِ اللہ کا حکم ہے جسے اپنے دل کے مزعومات اور رواجی فلسفوں اور غالب تہذیب کے تقاضوں کو ٹھکرا کر تسلیم کرنا ہے۔

اس وقت متعدد اطراف میں خاص خاص منکرینِ حدیث اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھے ہیں اور سیکولر مزاج مغربی طبقے کو اپیل کرنے والے مباحث چھیڑ رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اسلامی نظام کے چوڑے کی وجہ سے خوف اور بیزاری کا جو غبار اُن کے دلوں پر چھایا ہوا ہے وہ چھٹ جلتے۔ ہمارے علماء خوب سمجھ لیں کہ اس وقت اسلامی نظام کا راستہ روکنے کے لیے دنیا بھر کی مخالف اسلام قوتوں کی پشت پناہی چار محاذوں کو حاصل ہے۔ ایک ثقافتی محاذ، دوسرا دوش بدوش کا لغو لگانے والی مرعوب فرنگِ خواتین کا محاذ (جنہیں موجودہ حکومت محض دوپٹہ سر پہنکھنے کے لیے بھی راضی نہیں کر سکتی) تیسرا کمیونسٹ تحریک پسند سیاست بازوں کا محاذ اور چوتھا منکرینِ حدیث کا محاذ۔

اس چوتھے محاذ کے سامنے نقشہ یہ ہے کہ اقل تو اسلامی قوانین کے نفاذ کی رفتار بڑی سست ہے اور مجموعی نظام کے بجائے متفرق احکام ایک ایک کر کے سامنے آ رہے ہیں، دوسری طرف جن شکلوں میں قوانین ملحق ہو رہے ہیں اُن میں رخنہ رہ جاتے ہیں، تیسرے جس عدالتی نظام اور پولیس کے ذریعے ان کا عملی نفاذ ہوتا ہے اُس کی ایک سطح پر اسلامی قوانین کے لیے انقلابی انداز کی ذہنی تیاری موجود نہیں ہے اور دوسری سطح پر ہر قانون چلتا ہے اُس کا عملاً حلیہ بگڑ جاتا ہے۔

ایسے حالات میں چاہیے کہ علماء مسکرجم پر ایسی مدلی بحثیں سامنے لائیں کہ جن خاص طریقوں سے ذہنی بے اطمینانی پیدا کی جا رہی ہے، اُن کا توڑ ہو جائے اور اہل علم میں بھی اور عوام میں بھی جو ٹھوس سوالات پیدا کیے جا رہے ہیں، اُن کا شافی جواب سامنے آ جائے۔ میرے خیال میں ذہنی ابتری کے دور میں یہ کافی نہیں ہے کہ اتنی بات زور سے کہہ دی جائے کہ شروع سے آج تک فکری طور پر بھی امت مسکرجم

لے کاش کہ یہ گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دار ہوتا کہ آپ کے احکام کو کم سے کم کسی مارشل لا کے ڈکٹیٹر یا کسی جمہوری صدر یا وزیر اعظم یا پارلیمنٹ کے جاری کردہ احکام کی طرح واجبِ اطاعت سمجھتا۔ حکومت کے قوانین و احکام اور دفتری ضابطوں کی تو من مانی تعبیرات کر کے انہیں کھیل بنانے کی جوأت نہیں، لے لے کے ساری عقل اور ساری آزاد خیالی کا استعمال حضور کے ارشادات کے خلاف کیا جاتا ہے۔

پر متحد رہی ہے اور عملی طور پر بھی اس کا نفاذ جاری رہا ہے۔

مثال کے طور پر ریٹائرڈ جسٹس یعقوب علی خاں کا ایک مضمون میرے سامنے ہے جو پاکستان ٹائمز (مؤرخہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۱ء) میں چھپا ہے، اور یہ ایران کے حوالے سے اجرائے حدود کے متعلق ایک بحث پر مبنی ہے جو نیوز ویک مؤرخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ جسٹس موصوف کے بحث و استدلال کو تو یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ البتہ ان کے چند اہم نکات یا دعویٰ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام سے پہلے سنگین، وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں رائج تھیں۔ مگر اسلام چونکہ انسانیت سکھانے آیا تھا لہذا اس نے دوسرے شعبوں کی طرح جرم و سزائیں بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ اسلام اور صاحبِ اسلام کی رحمتہ للعالمین کے خلاف ہے کہ وہ مجرم کو پتھر مار مار کر ہاک کرنے کی سزا دے۔ ایسی سورت میں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں دیتا ہے۔

۲۔ سورہ نور کی آیت بلسہ سزائے زنا (آیت ۲) میں چونکہ زانی اور زانیہ کے الفاظ ”لال“ کے ساتھ آئے ہیں، لہذا آیت ہر قسم کے ارتکابِ زنا کو محیط ہے۔ زانی و زانیہ کے کنوارے یا نکاحی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی سب کی سزا سو کوڑے رہے گی (کوئی اور شخص کہہ سکتا ہے کہ سو کوڑے مارنا وحشیانہ سزا ہے پھر کیا ہوگا۔ نظریہ رحمتہ للعالمین تو کوڑوں سے بھی سخت مجروح ہوگا۔)

۳۔ رجم کے متعلق جتنی احادیث ہیں، احادیث میں حدِ رجم کے نفاذ کے جو واقعات اور صحابہ کرام کے ارشادات مذکور ہیں، وہ سب سورہ نور کی آیت نمبر ۲ کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں۔

۴۔ اگر حدِ رجم کے قرآن میں مذکور نہ ہوتے ہوئے اس کو دین یا قرآن کا تقاضا کہا جائے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن تمام امور میں اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔

۵۔ سورہ نور کی مقرر کردہ حد کو حدیث سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

۶۔ قرآن میں ۹ مقامات پر زنا موضوعِ کلام ہے۔ کسی ایک جگہ بھی رجم کا ذکر نہیں۔

۷۔ خوارج اور معتزلہ کے مفسرین کے حوالے سے یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ سورہ نسا میں چونکہ یہ حکم

ہے کہ اگر کوئی کینز زنا کا جرم کرے تو اسے آزاد عورت کے مقابلے میں آدھی سزا دی جائے اور رجم کی سزا کا آدھا کوئی معنی نہیں رکھتا، لہذا رجم شرعی حد نہیں ہے۔

میں یہاں ان نکات کا جواب نہیں دے رہا، بلکہ ان کو علماء کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ یہ ہیں وہ فکری الجھنیں جو کچھ ذہنوں میں ہیں اور وہ انہیں دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ صرف نکتہ نمبر ۱۱۱ ہے کہ چونکہ وہ بہت عام حلقوں میں بہ آسانی غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ لہذا میں خاص اس کا جواب تفہیم القرآن سے نقل کر رہا ہوں۔ یہ سورہ نسا کی آیت نمبر ۲۵ پر حاشیہ نمبر ۲۶ ہے۔

”سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوئی ہے جس سے خوارج اور ان

دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ————— اگر شادی شدہ عورت کے لئے شریعت اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لہذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں۔ ————— لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر

غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنَات (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورتیں جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو، دوسرے

خاندانی عورتیں جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں مُحْصَنَات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لئے دوسرے

معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نہ کہ پہلے معنی میں۔ جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے بخلاف اس کے لئے لونڈیوں کے لئے مُحْصَنَات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف

الفاظ میں فرمایا کہ جب انہیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَا مُحْصِنًا) تب ان کے لئے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائبہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات

بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنیاد پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے

اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی سب تک لونڈی ہے محض نہیں ہے۔ کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اُس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری۔ کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی ملک میں وہ تھی، اور نہ اُسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہذا اُسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی، نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورہ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلہ میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ یہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ محضات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوسری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن اُن کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا۔ لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اُس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلیا لڑکوں لوگوں سے مخفی رہ جائے، لہذا رہ جائے، نبی کے ذہن رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا۔

یہ عبارت درج کرتے ہوئے مجھے افسوس ہوا کہ جسٹس یعقوب علی جیسے حضرات بھی زیادہ گہرائی تک کاوش و مطالعہ نہیں کرتے۔

ایک اہم بحث جسٹس صاحب (اور دوسرے حضرات کی تحریروں میں ان روایات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے کہ آیت رجم نازل ہوئی تھی مگر منسوخ التلاوة ہوگئی۔ اس مخالفہ انگیز جواب کی تردید میں اور متعلقہ روایات کی تاویل میں رسائل و مسائل (از مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی محذور، حصہ ۳ کی طویل بحث (از صفحہ ۴۱) کے کسی بھی سلیم الطبع آدمی کو ٹہری مدد مل سکتی ہے جسٹس صاحب بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مہر گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ اہل تجدد کی پیدا کردہ ظلمتِ تشنگ کا ازالہ کرنے کے لیے علماء کو مخالفانہ دلائل کا قلع قمع ذرا زیادہ تفصیل سے کرنا چاہیے تھا۔